© rasailojaraid.com

۹۔ خوش معرکۂ زیبا، ص ۱۰۱

۱۰۔ محامدِ حیدریہ، ص ۱۳

۱۱۔ محامد حیدریہ، ص ۱۳-۱۴۔

۱۲۔ شمع انجمن، نواب صدیق حسن خان، بھوپال، ص ۶۳، اس کے علاوہ احمد حسین سحر کاکوروی نے اپنے تذکرے طورِ معنی میں اختر کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختر کو ملک الشعرا کا خطاب عطا ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "قاضی صادق اختر ... از عمائد روزگار و بہ ہمت وجود منسوب و مشہور است۔ از تصنیف محامدِ حیدریہ بمدح غازی الدین حیدر بادشاہ جم مرتبۂ لکھنؤ۔ بخطاب ملک الشعرائی سربلندی یافت ....."

۱۳۔ سوانحاتِ سلاطین اودھ، ج ۱، ص ۲۸۳۔

۱۴۔ خوش معرکۂ زیبا، ص ۱۰۱،

۱۵۔ خوش معرکۂ زیبا، ص ۱۰۱، اسٹوری، ج ۱، ص ۱۵۱، برٹش میوزیم میں فارسی مخطوطات کی فہرست از ریو، ج ۳، ص ۹۰۰۔

۱۶۔ حاشیہ خوش معرکۂ زیبا، تحتِ مرزا محمد تقی اختر،

۱۷۔ روزِ روشن، ص ۳۷

۱۸۔ اسپرنگر (ص ۱۶۶) نے یہ لکھا ہے کہ اختر کانپور کے قریب کسی جگہ ڈپٹی کلکٹر تھے۔

۱۹۔ تاریخ فرخ آباد (علی گڑھ، آزاد لائبریری) ورق ۱۵۵-۹۔ ولی اللہ نے قاضی اختر کے چند اردو اشعار بھی نقل کئے ہیں اور اسی طرح محامدِ حیدریہ کے حوالے سے اختر کی علمی و ادبی برتری کو خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔

۲۰۔ اسٹوری، ج ۱، ص ۱۵۱، برٹش میوزیم میں فارسی غالب، مطبوعہ پاکستان، ص ۲۷۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۱- اس خط کے لئے رجوع کریں۔ خطوط فارسی غالب، مطبوعہ پاکستان، ص ۲۷۱۔
۲۲- روزِ روشن، ص ۳۸
۲۳- قاضی محمد صادق اختر کی تصانیف کے بارے میں راقم کا مضمون۔ غالب اور تذکرۂ آفتاب عالمتاب سے رجوع کریں۔
۲۴- ایشیاٹک سوسائٹی کیٹالاگ، ج ۲، ص ۲۲۰، شمارۂ مخطوطہ: ۲۱۰
۲۵- ایشیاٹک سوسائٹی کیٹالاگ، ج ۲، ص ۲۲۰۔
۲۶- مخطوطۂ دیوان اختر، ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری، ورق ۳۶ ب
۲۷- ایضاً، ورق ۶- الف
۲۸- ایضاً، ورق ۳۲ ب
۲۹- سخن شعرا، نساخ، ص ۱۶، مجموعۂ نغز، ص ۵۷۔
۳۰- تذکرۂ سرور، ص ۹۸
۳۱- بزم سخن، ص ۱۲، بہر حال آفتاب عالمتاب میں اختر نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے کہ قتیل ان کے استاد ہیں۔
۳۲- دیوان اختر، ورق ۱۱۹- الف
۳۳- ایضاً، ورق ۵۰، الف
۳۴- ایضاً، ورق ۲- الف
۳۵- ایضاً، ورق ۵۱- ب
۳۶- ایضاً، ورق ۴۷، الف۔
۳۷- ایضاً، ورق ۴۵، ب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرے مولانا اکبر آبادی۔ کچھ باتیں کچھ یادیں

(۸ نومبر ۱۹۰۸ء تا ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء)

مسعود انور علوی کاکوروی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں بی، اے سالِ اول میں تھا، یعنی ۱۹۴۸ء۔ مولانا کا نام تو سنا تھا لیکن صورت آشنا نہ تھا۔ رمضان شریف آئے تو علی گڈھ مقیم ہونے کی بنا پر سلیمان ہال کی مسجد میں تراویح پڑھنے کے بجائے امیر نشاں کی ایک مسجد میں ڈاکٹر عبدالعلیم خاں شعبۂ دینیات کی اقتدا میں پڑھنے کا خیال آیا۔ کیا معلوم تھا کہ اس خیال میں اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی حکمت و عنایت پوشیدہ تھی۔ پہلے دن نماز کے اختتام کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف کے ساتھ ایک اور بزرگ کے ہمراہ مسجد سے باہر نکلا۔ باہر نکل کر انھوں نے استفسار کیا، ڈاکٹر صاحب موصوف نے میرا نام بتایا اور کہا "یہ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں" اب براہِ راست گفتگو کی۔ پوچھا "آپ کا وطن!" میں نے عرض کیا کہ "لکھنؤ کے پاس ایک چھوٹا سا قصبہ کاکوری" کہا "کاکوری تو ابتدا سے بڑا مردم خیز اور علماء ساز قصبہ رہا ہے" اس قدر گفتگو کے بعد وہ بزرگ اپنے مکان کی طرف مڑ گئے۔ میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ ان کے مکان تک آیا۔ پوچھا ڈاکٹر صاحب یہ کون صاحب تھے، کہنے لگے "ارے آپ نہیں جانتے، یہ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ہیں" نہ پوچھئے خوشی اور فخر کا کیا عالم ہوا، اگلے دن اس خیال سے کہ مولانا کے برابر نماز میں شریک ہوں وقت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جولائی ۱۹۸۶ء

پہلے ہی مسجد جا پہنچا، مولانا آئے تو اگلی صف میں برابر بیٹھ گئے۔ آج نماز ختم کرکے تینوں ایک ساتھ باہر نکلے تو ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہو کر مولانا کے ہمراہ ان کے مکان "الریان" (یونائیٹڈ کالونی۔ امیرستان) تک آیا۔ پھر تو روز کا معمول ہی ہو گیا، مولانا کو ان کے مکان تک پہنچا کر میں بھی اپنی راہ ہو لیتا تھا۔

مولانا خود ہی گفتگو کرتے رہتے۔ میں پی یو سی پاس کرکے بی، اے میں آیا تھا ویسے بھی کیا جانتا تھا کچھ تو اپنی کم مائیگی اور جہالت کا احساس اور کچھ ان کی علمی شہرت و وقار کا پاس، کبھی بھی عدم لکھنے پڑھنے کی بات نہ کی۔ آہ مولانا کی شفقت و محبت کو نہ بھول سکوں گا دو ایک مرتبہ یہ بھی ہوا کہ میں مسجد سے دیر میں نکل سکا تو دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ باہر کھڑے ہیں بڑا خفیف ہوا تقریباً ایک ماہ یہی سلسلہ رہا۔ رفتہ رفتہ وہ جھجک ایک حد تک دور ہوتی گئی۔ عید سے دو تین روز پہلے میں گھر چلا گیا چھٹیوں کے بعد آیا۔ تو کبھی کبھی مولانا سے اسلامک اسٹڈیز کی سیمینار لائبریری میں ملاقات ہو جاتی مگر بس سلام و خیر و عافیت تک وہ ان دنوں شعبہ اسلامیات میں وزیٹنگ پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ میں کبھی کبھی کسی خالی گھنٹہ میں اگر ان کو تنہا پاتا تو جا کر بیٹھ جاتا۔ رفتہ رفتہ گفتگو کا دائرہ وسیع ہوا اور وہ پڑھائی لکھائی کے بارے میں پوچھنے لگے۔ اس کے بعد تو متعدد مرتبہ ایسا ہوا کہ کلاس میں پڑھائے گئے اسباق میں جہاں کہیں اشکال ہوتا ان سے دریافت کرتا جسے وہ بڑی محبت و شفقت سے دور کر دیتے تھے۔ پڑھانے میں انھوں نے کبھی ہمت شکنی نہ کی بلکہ ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے۔ آج بھی جب اس بے لوث محبت و شفقت کو یاد کرتا ہوں تو آنکھیں ہی نہیں، دل بھی رو اٹھتا ہے۔

دل من داند و من دانم و داند دل من

اکثر سوچا کرتا کہ پتہ نہیں وہ کیوں مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقریباً دو سال اسی طرح گذر گئے۔ جب ۱۹۶۵ء میں ایم، اے عربی میں داخلہ لیا تو ایک روز مولانا سے عرض کیا۔ بہت خوش ہوئے اور بڑی فراخدلی سے کہا: "جب کوئی مشکل پڑے آجایا کیجئے۔" یہاں کیا تھا گویا منہ مانگی مراد مل گئی۔ اگلے دن ہی شام کو گھر پہنچا۔ بڑی محبت سے پیش آئے، ہمت افزائی ہوئی۔ پھر تو چوتھے پانچویں روز اگر مولانا علی گڑھ میں موجود ہوتے تو ان کے مکان پہنچ جاتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کچھ اساتذہ موجود ہوتے مجھے دیکھ کر تپاک سے کہتے، "آؤ میاں مسعود اور لپٹا لیتے ۔ مولانا کو عربی زبان و ادب پر جو قدرت حاصل تھی اُسے وہی لوگ خوب سمجھ سکتے ہیں جنہیں ان سے اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے عربی کے مختلف شعراء کے اشعار سنانے پر آتے تو ایسا لگتا کہ ان کے دیوان سامنے کھلے رکھے ہیں۔ ایک مرتبہ ابونواس اور ابوالعلاء المعری کا تذکرہ نکلا تو خمریات سے متعلق ابونواس کے بعد معری کے زہدیات پر نہ جانے کتنے اشعار سنا ڈالے۔ یہی نہیں بلکہ فارسی و اردو کے اشعار بھی اس کثرت سے یاد تھے کہ جب برمحل سناتے تو وجدان جھوم اٹھتا اور ناطقہ سر بہ گریباں ہو جاتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مولانا کو عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کس زبان پر سب سے زیادہ قدرت تھی میں نے اُن کی عربی عبارت بھی پڑھی اور انگریزی بھی، پتہ نہیں چلتا کہ کس میں روانی، سلاست اور جولانیٔ طبع زیادہ ہے۔

دن بیتتے گئے اور میں مولانا کے قریب آتا گیا۔ مولانا بھی، جب کچھ روز نہ جاتا تو استفسار کرتے "ارے بھئی کہاں تھے" میں نے ایک روز بیٹھے بیٹھے بے تکا سا سوال کر ڈالا

؎ یہ بھی میرے ساتھ اُن کی کمالِ شفقت و محبت تھی ورنہ وہ تو عام طور پر صرف زیادہ سے زیادہ مصافحہ پر ہی اکتفا کرتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"آپ برہان میں کیسے مضامین شائع کرتے ہیں؟" کہنے لگے "معیاری و تحقیقی ہوں۔ میں نے حتی الوسع اس کا خیال رکھا ہے کہ برہان کا معیار کسی طرح گرنے نہ پائے، حالانکہ اس سلسلہ میں مجھے دوستوں کی ناراضگیاں بھی سہنی پڑی ہیں۔ اس سلسلہ میں کسی فاضل پروفیسر کا ذکر کیا کہ ان کے قریبی عزیز نے دو یا تین مرتبہ مضامین لکھ کر دیئے مگر میں نے ناقابلِ اشاعت لکھ کر واپس کر دیئے کہ ابھی اور مشق کریں۔ اس پر ان پروفیسر صاحب نے مجھ سے شکایت کی کہ مولانا اس نے دو مرتبہ مضامین لکھ کر بھیجے قبل اس کے کہ وہ مزید کچھ کہیں میں نے کہا جی ہاں، آپ ایک مضمون لکھ کر ان کے نام سے دیدیجئے دیکھئے کہ شائع نہیں ہوتا ہے۔ وہ چپ ہو گئے۔"

میں نے پوچھا مولانا ہم برہان کے لئے کوئی مضمون دیں۔ کہا ضرور دیجئے، میں دیکھوں گا اگر معیاری ہوا تو ضرور شائع ہو گا ورنہ اگر زبان و بیان میں خامیاں ہوئیں تو آپ کو بتا دوں گا آپ درست کر لیجئے گا۔ عربی کے ایک مایۂ ناز شاعر ابوالطیب المتنبی پر ایک مضمون لکھ کر دیا پڑھا اور پسند کیا[1]۔ چار، پانچ ماہ گذر گئے مگر وہ مضمون نہ شائع ہوا۔ ایک بار تقاضا کیا۔ کہا مضامین کی بہت کثرت رہتی ہے آپ ایسے مضامین لکھئے جو نئے موضوعات پر ہوں یا ان شخصیتوں پر لکھئے جو اب تک گمنامی میں رہی ہیں۔

ایک روز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور اسی سلسلہ میں مولانا عبیداللہ سندھی پر گفتگو ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا سندھی تو فکر و فلسفہ ولی اللہی کے مشہور عالم تھے، انھوں نے ساری زندگی اسی کی افہام و تفہیم کے لئے گویا وقف کر دی تھی۔ کہنے لگے بڑی قابل و ذہین شخصیت تھی۔ میں نے ان سے بالواسطہ استفادہ

---

[1] مولانا مرحوم کو خود متنبی کے کلام سے بڑا شغف تھا اور اکثر و بیشتر اس کے حسن کلام اور اس کی عبقریت و ذہانت پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا ہے[1]۔ میں نے عرض کیا، مولانا سندھی نے اپنی ساری زندگی حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیمات، افکار و فلسفہ کے لئے وقف کر دی تھی مگر باوجود کوشش اور تلاش بسیار کے نہ انھیں شاہ صاحبؒ کا ملفوظ "القول الجلی فی ذکر آثار الولی" مل سکا اور نہ ہی حیاتِ ولی کے مؤلف مولوی رحیم بخش دہلوی کو ہی اس کا کوئی نسخہ دستیاب ہو سکا تھا۔ اس کا ایک نادر نسخہ دستیاب ہو سکا تھا، اس کا ایک نادر نسخہ کتب خانہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری میں موجود ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس میں شاہ صاحبؒ کے مکمل و مستند سوانح، افادات و ارشادات، خلفاء، مجاز اور بزرگوں کے حالات ہیں۔ مسرت و استعجاب سے کہا اچھا! اگر آپ کی رسائی ہو تو ضرور اس نادر مخطوطہ سے استفادہ کر کے مضامین لکھیے، میں ضرور برہان میں شائع کروں گا۔ کچھ عرصہ بعد جب وہاں گیا تو خانقاہ کاظمیہ میں موجود اس نادر نسخہ کی مدد سے جامع ملفوظ مولانا شاہ محمد عاشق پھلتیؒ پر ایک مضمون مرتب کیا۔ مولانا کی خدمت میں لا کر پیش کیا بالاستیعاب پڑھ کر بہت پسند کیا اور دو ایک جگہ اصلاحات کیں اور اگلے ماہ (اپریل ۱۹۸۳ء) میں اس کو شائع کر دیا۔ میری بڑی ہمت افزائی کی اور کہا اسی طرح ایسی گمنام اور اہم شخصیتیں اور فکر ولی اللٰہی کے ان پہلوؤں پر لکھنے کی کوشش کیجیے جن پر اب تک نہیں لکھا گیا ہے[2]۔ اس کے بعد متعدد مرتبہ خلوت و جلوت میں میری اس طرح حوصلہ افزائی کی کہ مجھ میں لکھنے کا

۱۔ مولانا احمد علی لاہوری جو مولانا سندھی کے شاگردِ رشید تھے، وہ مولانا اکبرآبادی کے استاد تھے خود مولانا اکبرآبادی نے "مولانا عبید اللہ سندھی اور اُن کے ناقدین" کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کی۔

۲۔ مولانا خود حضرت شاہ صاحبؒ کی عبقریت، مجددیت، جامعیت اور ہمہ گیری کی بنا پر اُن سے بہت زیادہ متاثر تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قول جلی کا مضمون شائع ہونے کے چند روز بعد ایک روز مغرب میں گیا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی، مولانا تقی امینی صاحب ناظم دینیات وقاری رضوان اللہ صاحب مرحوم صدر شعبہ دینیات وغیرہ بیٹھے تھے ان سے مخاطب ہو کر میرا تعارف کراتے ہوئے کہا یہی ہیں میاں مسعود انور جن کا ایک عالمانہ مضمون ابھی برہان میں نکلا ہے۔ میں پرسوں دہلی گیا تو وہاں بھی لوگوں نے مجھ سے اس مضمون کی تعریف کی وغیرہ۔ مجھے خوب اندازہ تھا کہ اس تعریف کا مقصد صرف حوصلہ افزائی وہمت افزائی تھی۔ ورنہ من آنم کہ من دانم ایک دوبار یہ بھی کہا کہ میاں! ہم لوگ تو اپنے دور کو کاٹ لائے، اب تو تم ہی جیسے نوجوانوں کا زمانہ ہے۔

نہ پوچھئے کہ مولانا مرحوم کے ان کلمات میں کتنا جادو تھا کہ میرا دل حوصلہ، عزم، ہمت اور اعتماد سے بھر اٹھتا تھا۔

جامع ملفوظ کے بعد میں نے قول جلی سے استفادہ کر کے چار مضامین اور لکھے۔ مولانا اکثر وبیشتر قول جلی کے مضامین ومطالب کے سلسلہ میں استفسار کرتے ہیں۔ میں نے چونکہ اس سے کافی استفادہ کیا تھا، اس لئے ان کو بالتفصیل عرض کرتا۔ مولانا بڑے استعجاب سے ان کو سنتے تھے۔ ان ہی دنوں وہ دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند اکیڈمی کے صدر ہونے کی بنا پر دیوبند میں قیام پذیر تھے۔ حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے اور اس کو ایڈٹ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، ایک روز کہنے لگے قول جلی ایسے اہم ملفوظ کی تو اشاعت ہونی چاہئے۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا اس کا اُردو ترجمہ بھی صاحب سجادہ خانقاہ کاظمیہ کے بھتیجے نے اپنے والد ماجد کے زیر نگرانی مکمل کرلیا ہے مگر اس دور کے فلاں فلاں علماء حضرات یہ چاہتے ہیں کہ اس کی اشاعت نہ ہو، اور اگر ہو بھی تو تلخیص کے بعد کیونکہ بقول ان کے اس سے ”اختلال پیدا ہوگا“ قدرے متزجر ہو کر کہا۔ یہ کوئی بات نہیں اگر وہ لوگ اپنی عصبیت وتنگ نظری سے اسکی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشاعت نہیں چاہتے تو نہ سہی اکبر آبادی بہرحال تنگ نظر نہیں ہے، آپ شاہ صاحب سے بات کر کے لے آیئے میں اسے ندوۃ المصنفین سے شائع کرادوں گا۔ یہ کوئی بات نہ ہوئی۔ تحقیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ کوئی نئی بات سامنے آئے تو اسے بے کم و کاست پیش کیا جائے جس کسی کو اس سے اختلاف ہو وہ اس کا رد کرے۔[1] اسی ضمن میں یہ بھی کہا کہ دیکھئے مولانا ابوالحسن زید صاحب نے "مولانا اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان" کیسی عمدہ کتاب لکھی ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا ہے۔[2] ایک روز موجودہ دور کے مولویوں کا ذکر ہو رہا تھا تو کہا۔ ارے یہ لوگ تو انخود غلط بر خود غلط ہیں۔

مولانا کے کردار کی سب سے بڑی اور نمایاں صفت و خوبی ان کی وسیع النظری تھی جس کی وجہ سے میں جو علم میں تو کوئی شمار ہی نہیں، عمر میں بھی اُن سے ترپن (۵۳) سال سے زائد چھوٹا تھا۔ ان کے اس قدر قریب ہوتا گیا جس کا اندازہ ان کے یہاں آنے جانے والوں اور متعلقین سبھی کو خوب ہے، ان کی نظر جس قدر وسیع و عمیق تھی اسی قدر ان کا دل بھی وسیع تھا، عصبیت و تنگ نظری تو اُن سے کوسوں دُور تھی۔ وہ ہر مکتب خیال کے لوگوں کی بڑی فراخدلی سے ہمت افزائی و پذیرائی کرتے خواہ وہ اس سے متفق ہوں یا نہ ہوں، وہ مضامین کی قدر و قیمت اس کے تحقیقی معیار کی کسوٹی پر جانچتے تھے اور یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کس نے کہا ہے، بلکہ کیا کہا ہے اور اگر جو کہا گیا ہے، اس میں معقولیت ہوتی تو وہ اس کی قدر کرتے تھے اور اس کی نشر و اشاعت میں بھرپور تعاون کرتے تھے۔ میرے

۱۔ افسوس کہ اس کی نوبت ہی نہ آسکی اور مولانا مرحوم ذہنی و جسمانی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ ۲۔ مولانا زید میاں صاحب نے احقر سے بھی زبانی یہ بیان فرمایا کہ مولانا اکبر آبادی اور مولانا سید حمد رضا صاحب بجنوری نے اس کتاب کو پسند کر کے مجھے تعریفی و تہنیتی خطوط بھیجے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے نو آموز، کم سواد، مبتدی کے لئے تو اُن کی ذات وہ منارۂ نور تھی جس کی روشنی میں مجھے ہمت ملی کہ میں بھی علمی و تحقیقی میدان میں قدم رکھنے کی جسارت کر سکوں۔ میرے لئے یہ بات بھی کم قابلِ فخر نہیں ہے کہ مرحوم نے اپنے موقر رسالہ کے متعدد اور متواتر شماروں میں میرے مضامین کو جگہ دی۔

میں نے ایک اور خاص اور اہم بات اُن کے کردار میں محسوس کی کہ باوجودیکہ وہ شہرت و عزت اور علم کی اُن رفعتوں پر پہنچ چکے تھے، جہاں کا تصور بھی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں مگر پھر بھی اُن میں علم کا غرہ، پندار اور انانیت نام کو نہ تھی۔ اُن کی بے نفسی خصوصاً ندوۃ المصنفین اور برہان کے سلسلے میں تو عدیم النظیر ہے۔ نہ اب برہان کو ایسا بے نفس مدیر ملے گا اور نہ ندوۃ المصنفین ایسے ادارے کو ایسا بے لوث سرپرست۔

مولانا بلا کے ذہین، نکتہ سنج، دقیقہ رس اور اعلیٰ درجہ کی ذہانت، فطانت، قوت ادراک اور بذلہ سنجی کے حامل تھے۔ اُن کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جنہیں ہم عبقری کہہ سکتے ہیں۔ اس ساڑھے چھ سالہ دور میں اُن سے ملاقات کا ایک ایک پل ذہن و دماغ پر نقش ہے۔ مولانا کا خیال آتے ہی اُن کے ساتھ گذارے ہوئے لمحات ایک ایک کرکے ذہن کے پردے پر آنے لگتے ہیں، اور عزیز لکھنوی کا شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اُن کا نام آتے ہی بیتے دنوں کی پُرانی یادیں، اُن کی شگفتہ گفتگو، ظرافت و مزاح، حاضر جوابی، اُن کے زمانۂ طالب علمی کے واقعات، اُن سے ندوۃ المصنفین اور علی گڑھ میں ملاقاتیں، سب ذہن و دماغ میں جاگر ہو کر ایک حسرت و یاس کا عالم طاری کر دیتی ہیں ع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یادِ ماضی کے بہت نقش ابھی باقی ہیں حافظہ دل کی طرح زود فراموش نہیں

زبان و بیان پر مولانا کو وہ قدرت حاصل تھی کہ جب علماء و فضلاء کے مجمع میں بھی بیٹھتے تو اپنی گفتگو اور شگفتہ روانی سے اس محفل کو بھی لالہ زار بنادیتے محفل پر اس طرح چھا جاتے کہ لگتا بس مولانا ہی مولانا ہیں۔ حاضر جوابی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں اُن کے دو ایک واقعات لکھنا بے محل نہ ہوں گے۔

ایک مرتبہ ایک سمینار میں مولانا نے بڑی مُدلّل مؤثر تقریر کی۔ کمرہ تحسین و آفرین سے گونج اٹھا۔ تقریر کے بعد ایک محترمہ اپنے جذبات کو روک نہ سکیں مولانا کے پاس آئیں اور کہہ ہی دیا "مولانا آپ نے اتنی عمدہ تقریر کی کہ میرا جی چاہتا ہے آپ کے ہاتھ چوم لوں۔" میں اور آپ ہوتے تو شاید زیادہ سے زیادہ مسکرا کر یا شکریہ ادا کر کے چُپ ہو جاتے مگر بھلا مولانا کب چُپ کرنے والے تھے۔ برجستہ بڑی معصومیت سے کہا لیکن میں نے ہاتھوں سے تو کوئی کام لیا نہیں۔ سمجھنے والوں نے ایک قہقہہ لگا دیا۔ ذرا اندازہ کیجیے اُن محترمہ کا کیا حال ہوا ہوگا۔

ایک روز سہ پہر کو مولانا سے ملنے گیا۔ مولانا تقی امینی صاحب بھی بیٹھے تھے۔ نمازِ مغرب کا وقت آیا۔ تینوں نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد پان لائے گئے۔ مولانا تقی امینی صاحب نے مولانا کی طرف بڑھائے پھر میری طرف بڑھائے، میں نے معذرت کی تو مولانا نے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا "میں نے ان سے کتنی بار کہا مگر یہ تو کسی طرح سُرخ رو ہونا ہی نہیں چاہتے۔"

ایک روز سہ پہر کو پہنچا۔ مولانا چائے پینے جا رہے تھے، میں نے پہنچ کر پیالی میں چائے بنا کر پیش کی، مجھ سے کہا "اپنے لیے؟" میں نے معذرت کی "ہم چائے نہیں پیتے۔" کہنے لگے "واہ یہ تو غلط ہے جو پیتا نہیں اُس کو پلانے کا کیا حق پہلے خود پیئے پھر پلائے۔" میں نے لاجواب ہو کر چُپ چاپ چائے بنالی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا صبر و رضا اور استقلال کے پیکر تھے۔ بڑے سے بڑے حادثہ کو ہنسی خوشی برداشت کر جاتے۔ خود بتاتے تھے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے کے دوران ہم لوگ قرول باغ دہلی میں رہتے (ندوۃ المصنفین اُن دنوں وہیں تھا) بلوائیوں نے اچانک حملہ کر دیا تو سب اہل و عیال تمام ساز و سامان چھوڑ چھاڑ جان بچا کر بھاگے۔ ایک جگہ جا کر پناہ لی تقریباً دو دن تک بے آب و دانہ رہے۔ کہتے تھے کہ میاں دو دن بعد جو جو کی روٹی اور چٹنی کھانے میں مزہ ملا وہ مدت العمر لذیذ سے لذیذ تر غذا میں نہ ملا۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو ایک غیر مسلم ملازم شیر جنگ کے ہمراہ اپنے لُٹے ہوئے مکان پہنچے تو وہاں سوائے ملبہ کے کچھ نہ تھا۔ کہتے تھے کہ اثاث البیت کی تباہی کا وہ غم نہ ہوا وہ تو اللہ تعالیٰ شاید پھر دیدے مگر قیمتی و نادر کتابوں کے جلنے و لُٹنے کا وہ قلق ہوا کہ شدتِ غم سے وہیں پر بیٹھ گیا۔

۱۹۴۷ء کے ہنگامہ کے زمانہ میں مولانا سینٹ اسٹیفن کالج میں لکچرر تھے، جان کے خوف اور اس پر آشوب و مسلم کُش ماحول کی وجہ سے وقتی طور پر مولانا اکبر آبادی کے بجائے مسٹر اکبر آبادی ہو گئے تھے۔

مولانا کی اہلیہ بھی مستقل بیمار رہتی تھیں۔ ان کا ذریعۂ آمدنی محدود تھا۔ دوگھر سے دوستوں کی قسمت دیکھئے کہ اولاد کے معاملہ میں قدرت نے دونوں کے حق میں شاید ایک ہی فیصلہ کر دیا تھا میری مراد ہے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا اکبر آبادی سے، ان کے ایک بیٹے بھی دائم المریض تھے صرع کے دوروں کا شکار تھے۔ مولانا ان کی وجہ سے حد درجہ پریشان رہتے تھے۔ آخر زمانہ میں مَیں نے مولانا کی حسبِ خواہش خانقاہ کاظمیہ کے صاحب سجادہ محترم مولانا شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر مدظلہٗ سے اس کا ایک مجرب تعویذ بھی لاکر دیا تھا جس کو پہننے کے بعد بقول مولانا کے' بیٹے کو کافی فائدہ بھی ہوا تھا مگر مرحوم سے وہ تعویذ کہیں گم ہو گیا۔ مولانا مرحوم نے اکثر مجھ سے اپنے ذہنی کرب و انتشار کا ذکر کیا، حالانکہ وہ عام طور پر کبھی کسی سے اس کا اظہار نہ کرتے، اندر ہی اندر گھُٹتے رہتے۔ ذرا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذراسی بات پر دل کھول کر قہقہے لگایا کرتے ۔شاید اس لئے کہ دل کا معاملہ کسی پر کھلنے نہ پائے مگر مجھے ایسا لگتا تھا کہ ان کے یہ قہقہے اُن کے ذہنی کرب و اضطراب کی جھنکار ہیں۔

ایک مرتبہ مولانا نے دیوبند سے مجھے خط لکھا، میں اُن دنوں کاکوری میں تھا کہ میں لکھنؤ آرہا ہوں۔ ندوہ میں مجلسِ شوریٰ ہے، قیام چار باغ مسافر خانہ میں ہوگا۔ آپ ضرور ملیں تاکہ وقت نکال کر آپ کے ساتھ کاکوری چلوں۔ آپ کے یہاں کچھ قیام کروں اور وہاں خانقاہِ کاظمیہ میں موجود شاہ ولی اللہؒ کے عہد کے ان کے مصنفات نیز قلمی بھی دیکھوں۔ میں گیسٹ ہاؤس پہنچا۔ معلوم ہوا میٹنگ ہو رہی ہے ایک نہیں دو مرتبہ گیا باوجود کوشش کے مولانا سے ملاقات نہ ہو سکی۔ دو ایک منتظمین حضرات نے یہ کہہ کر کہ بہت اہم مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے، نہ آپ اندر جا سکتے ہیں نہ مولانا باہر آ سکتے ہیں۔ میں نے پرچہ لکھا مگر وہ بھی اندر نہ بھیجا گیا تو جھنجھلاہٹ میں بادلِ ناخواستہ کاکوری واپس آ گیا۔ ملال تو بہت ہوا، دو روز بعد ہی علی گڈھ گیا مولانا سے ملاقات ہوئی، ملتے ہی شکایت کی کہ میں انتظار کرتا رہا۔ میں نے تمام حال عرض کیا معلوم ہوا کہ وہ پرچہ بھی ان تک نہ پہنچ سکا کسی قدر متفکر ہو کر کہا، ارے یہ لوگ تو از خود غلط ہیں۔ آپ بغیر کو مجھے چلے آتے میں تو اندر موجود تھا۔

مولانا ہمہ وقت ذہنی تفکرات میں گھرے رہتے تھے مگر اس کے باوجود اُنھوں نے جو قابلِ قدر علمی وتحقیقی اور ادبی سرمایہ اپنی یادگار چھوڑا وہ اہلِ علم و ادب کے لئے سرمۂ بصیرت ہے۔ اگر اُنھیں ہر طرح کا ذہنی سکون میسر ہوتا تو نہ معلوم وہ کیا کیا کر جاتے، مجھے اکثر یہ شعر سنایا:۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے ۔۔۔۔ مُردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

گویا مولانا خود اپنے آپ کو تلقین کرتے تھے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۸۴ء کے حادثہ نے تو اُنھیں بالکل کھوکھلا اور گم کر دیا تھا کسی شفیق باپ کے کبرسنی میں اس کی اولاد کا اس طرح

© rasailojaraid.com